پریم چندکے افسانوں میں خودکلامی کے عناصر

ڈاکٹر غلام فریدہ

ABSTRACT:
Prem Chand is one of the Greatest short story writer of twentieth century.He has made various experimental attemps to bring about technical and thematic changes in urdu short stories.Monologue is one of these experiments which interprets the characters inner feelings as well as his unconscious thoughts.Prem Chand potrays the internal dispair,anger and delinquency of his characters through monologue.This article deals with the study of monologue in Prem Chand,s short stories .

اردو افسانے میں خود کلامی کے باقاعدہ تکنیکی تجربات کا آغاز مغرب کی نفسیاتی توجیہات کی بدولت سامنے آیا۔ تاہم خود کلامی کے لا شعوری استعمالات اردو افسانے میں ابتداء ہی سے ملتے ہیں ۔ ابتدائی افسانہ نگاروں میں سب سے نمایاں نام پریم چند کا ہے ۔ پریم چند کے افسانے اس حوالے سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے اپنے افسانوں میں جو تکنیکی تجربات نظر آتے ہیں ان کی گونج بعد کے اردو افسانے میں باز گشت کی صورت سنائی دیتی ہے ۔ جہاں ایک فنکار کے فن پر اس حد تک مقصدیت غالب ہو تو پھر وہاں تکنیکی تجربات کی گنجائش نہیں رہتی تاہم پریم چند کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے مقصدیت کی آڑ میں افسانے کے فنی خصائص پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ پریم چند نے جب افسانے لکھنے شروع کیے اس وقت ان کی انگریزی ادب سے واقفیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسی لیے ان کی کہانیوں کا ڈھانچا مشرقی کہانیوں کی طرز پر ترتیب دیا گیا۔ان میں ابھی تک فنی شعور اتنا پختہ نہیں تھا کہ وہ خود کو مشرقی داستانوں کے سحر سے آزاد کر پاتے۔ تاہم تکنیکی اعتبار سے پریم چند کے ابتدائی مجموعے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے کیونکہ یہی شکستہ اور بے جوڑ تکنیکی تجربات بعد میں ان کے مقلدین اور خود ان کے فن میں پروان چڑھ کر مکمل شکل میں سامنے آئے۔

''سوزِ وطن '' میں شامل ابتدائی افسانوں میں داستانوں کے تخیلی اور طلسماتی عناصر کی کارفرمائی غالب نظر آتی ہے ۔ تاہم بعد کے افسانوں میں یہ عناصر کم ہوتے جاتے ہیں ۔ افسانہ'' تو یہی میرا وطن ہے'' داستانوی ماحول سے آزاد افسانہ ہے اس میں ابتدائی کہانیوں جیسی حسن و عشق اور رنگین بیانی کی فضا مفقود ہوتی نظر آتی ہے ۔ پریم چند کا یہ افسانہ خود نوشت سوانح عمری کی تکنیک میں لکھا گیا ہے ۔ کہانی میں مصنف اپنی گزشتہ زندگی کا احوال صیغۂ ماضی میں سناتا ہے۔ افسانے کا واحد متکلم ناسٹلجیا کے حصار میں ہے اس لیے وطن واپس آنے کے بعد جہاں بھی اس کی

نگاہ پڑتی ہے وہ فوراً ماضی کی طرف لوٹتا ہے ۔ ماضی کی طرف یہ مراجعت اُسے خود کلامی کی طرف لے جاتی ہے ۔ یہاں خود کلامی ماضی اور حال کے موازنے سے پیدا ہوتی ہے اور مصنف ردّ و قبول کے مراحل سے گزر کر کہانی میں نیا رنگ پیدا کرتا ہے:

اہا! یہ وہ نالا (کذا) ہے جس میں ہم روز گھوڑے نہلاتے اور خود غوطے لگاتے تھے۔ مگر اب اس کے دونوں طرف کانٹے دار تاروں کی چہار دیواری کھینچی ہوئی تھی اور سامنے ایک بنگلہ تھاجس میں دو تین انگریز بندوقیں لیے ادھر ادھر تاک رہے تھے...ہم بھی اس ٹاٹ کے فرش پر قلابازیاں کھایا کرتے کبھی کبھی وہاں پنچائیت بھی بیٹھتی تھی جس کے سر پنچ ہمیشہ پتا جی ہی ہوتے تھے ۔ اس چوپال سے ملحق ایک گئو شالہ تھا جہاں گاؤں بھر کی گائیں رکھی جاتی تھیں اور ہم یہیں بچھڑوں کے ساتھ کلیلیں کیا کرتے تھے۔(۱(

پریم چند کے افسانہ'' عشق دنیا اور حُبِ وطن'' میں خود کلامی کا تجربہ بڑی کامیابی سے کیا گیا ہے ۔ یہ دو محبت کرنے والوں کی کہانی ہے ۔ دونوں نے اپنی اپنی محبت کی خاطر زندگی قربان کر دی۔ ایک نے وطن کی محبت اور دوسرے نے محبوب کی خاطر قربانی دی۔ پریم چند کے اس افسانے کا دورانیہ بہت طویل ہے اور اسے مختلف حصّوں میں تقسیم کر کے ابواب کی صورت میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس افسانے کی کامیابی کا راز اس بات میں ہے کہ کہانی میں جہاں کرداروں کے خارجی خصائل بیان کرنا مقصود ہوں وہاں پریم چند نے بیانیہ تکنیک سے کام لیا ہے اور جہاں کرداروں کی باطنی دنیا کو دکھانا ہو،وہاں مصنف خود درمیان سے نکل جاتا ہے اور خود کلامی کے ذریعے کہانی کو آگے بڑھاتا ہے ۔ تکنیکی اعتبار سے یہ نہایت کامیاب تجربہ ہے جس میں قاری کے ذہن پر نہ صرف کردار کا مکمل نقش بیٹھ جاتا ہے بلکہ کہانی بھی بھرپور تاثر قائم کر دیتی ہے ۔ ایک جگہ پریم چند افسانے کی کردار میزینی کے کردار کے داخلی تاثرات خود کلامی کے ذریعے اس طرح بیان کرتے ہیں :

میزینی اپنے خیالات میں غرق ہے ۔ آہ! بد نصیب قوم! اے مظلوم اٹلی ! کیا تیری قسمتیں کبھی نہ سدھریں گی ۔ کیاتیرے سینکڑوں سپوتوں کا خون ذرا بھی رنگ نہ لائے گا ، کیا تیرے ہزار ہا جلا وطن دیس سے نکالے ہوئے جانثاروں کی آہوں میں ذرا بھی تاثیر نہیں ، کیا تو ظلم و جفا غلامی اور اطاعت گزاری کے دام میں ہمیشہ گرفتار رہے گی... آزادی ہائے آزادی! تیرے لیے میں نے کیسے کیسے دوست جان سے پیارے دوست قربان کئے ...کیا یہ سب قربانیاں ، کیا یہ سب نذریں کافی نہیں ؟ آزادی تو ایسی قیمتی شے ہے !! ہاں تو پھر میں کیوں زندہ ہوں ۔ کیا یہ دیکھنے کے لیے کہ میرا پیارا وطن میرا پیارا دیس دغا پرست جفا شعار دشمنوں کے پیروں تلے روندا جائے ۔ میرے پیارے بھائی میرے پیارے ہم وطن ... یہ دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہ سکتا۔(۲(

یہاں پریم چند نے میزینی کے کردار میں حب الوطنی کے جذبے کو خود کلامی کے پیرائے میں نہایت کامیابی سے برتا ہے۔

پریم چندکے افسانہ '' خنجرِ وفا '' میں بھی جذبہ حب الوطنی کے حوالے سے خود کلامی کا اظہار ملتا ہے۔ افسانے میں جے گڑھ اور بجے گڑھ کی ریاستوں کے باہمی عناد اور جنگی صورتحال کو

بیان کیا گیا ہے ۔ افسانے کے اختتام پر عسکری کا باپ ایک لاچار اور بے بس وطن پرست کے طور پر سامنے آتا ہے ۔ ایک طرف بیٹے کی محبت جوش مار رہی ہے اور دوسری جانب وطنِ عزیز کی مٹی سے محبت کا بے پایاں جذبہ ہے ۔ اس دوہری کشمکش اور اذیت کا اظہار خود کلامی کے ذریعے ہوتا ہے:

کل جے گڑھ کی پاک سر زمین غنیم کے نقارہ فتح کی صداؤں سے گونج اُٹھے گی۔ میری مائیں اور بہنیں اور بیٹیاں اس کی وفا سوز بدعتوں کا شکار ہوں گی۔ سارے ملک میں قتل و غارت کے ہنگامے برپا ہوں گے ۔ پرانی عداوت اور قدورت کے شعلے بھڑکیں گے ۔ کنج مرقد میں سوتی ہوئی روحیں دشمن کے قدموں سے پامال ہوں گی ۔ وہ تعمیرات جو ہماری گذشتہ عظمت کی زندہ روائیتیں ہیں ، وہ یاد گار یں جو ہمارے بزرگوں کی تبرکات ہیں ... وہ نیم وحشی ، کندہ نا تراش لشکریوں کی فرد گاہیں بنیں گی۔(۳(

افسانے کے اختتام پر عسکری کے باپ کا المیہ اس کے داخلی تاثرات سے واضح ہوتا ہے جب جے گڑھ اور بجے گڑھ کی فوجیں باہم پیکار ہیں اور فیصلے کی گھڑی قریب ہے ۔ اس وقت اس کردار کی ذہنی کشمکش داخلی خود کلامی کے ذریعے بیان کی گئی ہے ۔یہ خود کلامی دعائیہ اسلوب کی حامل ہے:

خدایا ان جانبازوں پر رحم کر، ان کی مدد کر، ... مجھے رو سیاہ بننا منظور ہے ۔ مجھے دوزخ کی صعوبتیں سہنی منظور ہیں ۔ میں ساری دنیا کے گناہوں کا بار سر پر لینے کو تیا ر ہوں ۔ صرف اس وقت مجھے گناہ کرنے کی ، پیمانِ وفا توڑنے کی ، نمک حرام بننے کی توفیق عطا کر ۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے شیطان کے حوالے کر دے میں نمک حرام بنوں گا۔ دغا باز بنوں گا پر قوم فروش نہیں بن سکتا۔(۴(

اسی طرح فسانہ '' خاک و پروانہ'' میں انھوں نے غیر مرئی صفات کو مجسم کردار کی صورت میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ افسانے کا واحد متکلم اپنی ذلت اور رسوائی کو خود کلامی کے پیرائے میں بیان کرتے ہوئے ان غیر مرئی اشیاء کا سہارا لیتا ہے جس سے کردار کی داخلی دنیا متحرک اور مجسم صورت اختیار کر لیتی ہے:

آہ! بد قسمت میں ! میرے شامتِ اعمال نے آج یہ دن دکھائے کہ ذلت بھی میرے اوپر ہنستی ہے اور یہ سب میں نے اپنے ہاتھوں کیا۔ شیطان کے سر کیوں الزام دوں ، قسمت کو کیوں صلواتیں سناؤں ۔ شدنی کو کیوں روؤں جو کچھ کیا میں نے دیدہ و دانستہ کیا۔ ابھی ایک سال گزرا جب میں خوش نصیب تھا۔ اقبال میرا خادم اور ثروت میری کنیز تھی۔ دنیا کی نعمتیں میری رُو برو دست بستہ حاضر تھیں ۔ لیکن آج رسوائی اور نکبت اور شرمندگی میرے حالِ زار پر افسوس کرتی ہے۔(۵(

افسانہ'' شکوہ و شکایت'' خط کی صورت میں خود کلامی کا اظہار ہے ۔افسانے کی واحد متکلم روایتی ہندوستانی عورت ہے۔ یہ عورت ایک بیوی ہے اور خط کی تکنیک میں اپنے شوہر کی شکایات بیان کرتی ہے۔ پورے افسانے میں کہیں بھی مخاطب کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا ۔تاہم واحد متکلم کا انداز تخاطبانہ ہے۔ ممتاز شیریں اس افسانے کے حوالے سے کہتی ہیں :

منشی پریم چند کا افسانہ'' شکوہ و شکایت'' بالکل سادہ بیانیہ انداز میں ہے یہاں مصنف ''وہ'' میں چھپا ہوا ہے ۔ ایک عورت بیان کرتی جا رہی ہے اپنے شوہر کی خامیاں ، میٹھی میٹھی شکایتیں ۔ اس چھوٹے سے افسانے میں نہ صرف شوہر کے کردار کا خاکہ بڑی کامیابی سے کھینچا گیا ہے بلکہ ایک خوشگوار اور ہموار ازدواجی زندگی کا عکس بھی ہے۔ ''شکوہ و شکایت'' تکنیک کے اعتبار سے خود کلامیہ Monologue ہے۔(۶)

اس افسانے میں مصنف نے ایک شوہر کا شخصی خاکہ خط کی صورت میں بیان کیا ہے۔ اس افسانے کا تکنیکی کمال یہ ہے کہ بیوی جو شوہر کی برائیاں اور خامیاں بیان کر رہی ہے وہ دراصل شوہر کی خوبیاں ہیں جیسے ایک جگہ بیوی شکایت کرتے ہوئے کہتی ہے:

ایک باریک زیور بنوانا تھا، میں تو حضرت کو جانتی تھی ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ایک پہچان کے سنار کو بُلا رہی تھی اتفاق سے آپ بھی موجود تھے۔ بولے یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں دھوکا کھاؤ گی ، میں ایک سُنار کو جانتا ہوں میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں ، میرے ساتھ چال بازی نہیں کر سکتا،... برسوں کے پیہم تقاضوں کے بعد جب چیز بن کر آئی تو روپے میں آٹھ آنے تانبا،اور اتنی بد نماکہ دیکھ کر گھن آتی تھی۔ برسوں کا ارمان خاک میں مل گیا۔(۷)

واحد متکلم کی زبانی اس کے شوہر کا جو خاکہ قاری کے ذہن میں آتا ہے وہ متنازعہ فیہ ہے۔ ایک طرف اس کا شوہر اپنے خارجی اور دفتری معاملات میں اس حد تک پابند ہے کہ کسی بھی معاملے میں ذرا سی اونچ نیچ برداشت نہیں کرتا ۔ طبیعت کی خود داری کے باعث کئی بار نوکری سے بر طرف کیا گیاجبکہ دوسری طرف یہی کردار گھریلو معاملات میں بالکل بوگس اور غیر متحرک نظر آتا ہے۔ وہ نظم و ضبط اور تر تیب جو دفتری معاملات میں ملحوظ تھاوہ یہاں قطعاً ناپید ہے ۔ تاہم یہ کردار اس حوالے سے آزاد خیال معلوم ہوتا ہے کہ بچوں پر بے جا پابندیاں عائد کرنے کے خلاف ہے ۔ اس کے برعکس وہ جدید تعلیم اور جدید سوچ کا حامل ہے ۔

واحد متکلم کی اپنے شوہر سے متعلق شکایات سے نہ صرف ان کے شوہر کا خاکہ سامنے آتا ہے بلکہ اس کے ساتھ بیوی کے خاکے کے نقوش بھی اُبھرتے ہیں او رآخر میں بیوی ایک خالص مشرقی بیوی کے روپ میں سامنے آتی ہے جسے اپنے شوہر کی خامیوں سے بھی اُنسیت ہے:

مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انھیں پیار کرتی ہوں ...آج اگر تقدیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پُتلا حسن اور دولت کا دیوتا بھی دے تو میں اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھوں ...بلکہ شاید آج میں ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کرنے پر بھی تیار نہیں ہوں۔(۸)

یہ پورا افسانہ واحد متکلم کا خود کلامیہ (Monologue) ہے تاہم پریم چند کے بیشتر افسانوں میں جزوی طور پر بھی داخلی خود کلامی کی تکنیک سے کام لیا گیا ہے۔ افسانہ'' ادیب کی عزت'' میں ادیب کے تلخ تجربات کو احساساتی سطح پر خود کلامی کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ ادیب کسی بھی

معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے لیکن معاشرتی قوانین اس کی حساسیت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُسے کرب اور تکلیف سے دوچار کرتے ہیں ۔ اس افسانے کا مرکزی کردار قمر صاحب ایک ادیب ہے۔ اور اپنی داخلی ضرورت کے تحت ادب کی خدمت میں مصروف ہے۔ اس ادبی عبادت کے عوض وہ معاشرے سے محض عزت اور توقیر کا طلبگا رہے لیکن ہمارا سماجی نظام اسے اس کا جائز مقام دینے سے گریزاں ہے ۔ ایسے میں ادیب کی شخصیت انتشار کا شکار ہو جاتی ہے ۔ افسانے میں قمر صاحب ایک رئیس کے ہاں مدعو تھے۔ تقریب میں شہر بھر کے معززین اور بڑے عہدیدار شامل تھے۔ ان سب لوگوں کے درمیان قمر صاحب کی ذات جس طرح تنقید کا نشانہ بنی اور انھیں جس احساسِ تذلیل اور بے وقعتی کا سامنا کرنا پڑا اُسے پریم چند نے قمر صاحب کی ہم کلامی کی صور ت میں بیان کیا ہے:

انھوں نے اپنے آپ کو طعن کی ۔ تمہارے جیسے عزت کے ہوس مندوں کی یہی سزا ہے ۔اب تو آنکھیں کُھلیں کہ تم کتنی عزت کے مستحق ہو۔ تم خود اس غرض مند دنیا میں کسی کے کام نہیں آ سکتے۔وکیل ۔ بیرسٹر ، تمہارا احترام کیوں کریں ؟ تم ان کے مؤکل نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر اور حکیم ہماری طرف کیوں دیکھیں ؟ انھیں بغیر فیس کے گھر آنے کی ضرورت نہیں ۔ تم لکھنے کے لیے بنے ہو۔لکھتے جاؤ بس دنیا میں تمہارا اور کوئی مصرف نہیں ۔(۹(

پریم چند کے افسانوں میں تاثراتی خود کلامی کی کیفیت بھی ملتی ہے ۔ افسانہ'' روشنی'' میں انھوں نے کردار پر اثر انداز ہونے والے ماحولیاتی عناصر کا تاثراتی انداز میں تجزیہ کیا ہے جس سے اس کردار کی داخلی کیفیات زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہو کر افسانے کے باطن سے جھانکنے لگی ہیں ۔ افسانے کا واحد متکلم ایک دن گجن پور کے تھانے کے معائنے کے لیے جاتا ہے اور وہاں کے فطری مناظر کی دلکشی اس کی ذہنی رو کو کسی اور سمت لے جاتی ہے:

ذرا ذرا سے مزارعے تھے۔ وہی باوا آدم کے زمانے کے بوسیدہ ہل وہی افسوسناک جہالت، وہی شرمناک نیم برہنگی اس قوم کا خدا ہی حافظ ہے ۔ گور نمنٹ لاکھوں روپے زراعتی اصلاحوں پر صرف کرتی ہے ۔ نئی نئی تحقیقاتیں اور ایجادیں ہوتی ہیں ...مغرب میں تعلیم کا طوفانِ بے تمیزی برپا ہے۔ یہاں مدرسوں میں کُتے لوٹتے ہیں ۔ جب مدرسے میں پہنچ جاتا ہوں تو مدرس کو کھاٹ پر نیم غنودگی کی حالت میں لیٹے پاتا ہوں ۔ جس قوم پر جمود نے اس حد تک قبضہ کر لیا ہواس کا مستقبل انتہا درجے مایو س کُن ہے۔(۱۰(

یہ خود کلامی در اصل کردار کا تاثراتی بیان ہے۔ واحد متکلم کا ذہن اس وقت تقابلی صورتحال سے دوچا ر ہے۔ ایک طرف وہ مغرب کی تعلیم اور ترقی سے متاثر ہے دوسری طرف گجن پور کی پسماندگی اور کسانوں کی جہالت اُسے سخت بے چین کر رہی ہے ۔ چنانچہ افسانے کے اس حصّے میں پہنچ کر واحد متکلم کی خود کلامی غیض و غضب سے عبارت ہو جاتی ہے اوروہ تقریری انداز میں اپنی داخلی کیفیات کا اظہار کرتا ہے:

جس قوم میں اس پیغام پر عمل کرنے کی قوت نہیں ہے ۔ اس کا مستقبل تاریک ہے جہاں آج بھی نیم برہنہ گوشہ نشین فقیروں کی عظمت کے راگ الاپے جاتے ہیں جہاں آج بھی شجر و حجر کی

عبادت ہوتی ہے ۔ جہاں آج بھی زندگی کے ہر ایک شعبے میں مذہب گُھسا ہوا ہے ۔اگر اس کی یہ حالت ہے تو تعجب کا مقام نہیں ۔(۱۱(

افسانے میں بعض اوقات کردار آشوبِ زمانہ سے تنگ آ کر خدا تعالیٰ کی ذات سے شکوہ کرتا ہے یا مدد کا طلبگار ہوتا ہے ۔ افسانے کے اس حصّے کو دعائیہ خود کلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ یہ خود کلامی کردار کے داخلی احساسات اور باطنی و نفسی کیفیات کو بیان کرنے کا ایک وسیلہ ہے ۔ اس قسم کی خود کلامی میں مصنف کی اپنی ذات شامل نہیں ہوتی بلکہ یہ کردار کی سراسر ذاتی التجا ہوتی ہے ۔ جدید اردو افسانے میں چونکہ کردار کی باطنی جہت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اس لیے اس قسم کی خود کلامی اکثر افسانہ نگاروں کے ہاں نظر آتی ہے۔ دعائیہ خود کلامی کے حامل کردار بے بس اور مجبور کردار کے طور پر سامنے آتے ہیں ۔ اس لیے وہ اپنی بے چینی اور تھکن کا اظہار براہِ راست خدا تعالیٰ کی ذات سے کرتے ہیں ۔ پریم چند کے افسانہ'' خنجر وفا'' کا آخری حصّہ دعائیہ خود کلامی کی صورت میں ہے جس میں افسانے کا مرکزی کردار ایک بے بس اور مجبور باپ ہے اور وہ دعا کے پیرائے میں اپنی بے بسی اور لاچارگی کا اظہار کر رہا ہے:

خدایا! ان جانبازوں پر رحم کر، ان کی مدد کر،... مجھے رو سیاہ بننا منظور ہے۔ مجھے دوزخ کی صعوبتیں بھی منظور ہیں ۔ میں ساری دنیا کے گناہوں کا بار سر پر لینے کو تیار ہوں ۔ صرف اس وقت مجھے گناہ کرنے کی پیمان وفا توڑنے کی نمک حرام بننے کی توفیق عطا کر۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے شیطان کے حوالے کر دے میں نمک حرام بنوں گا۔ دغا باز بنوں گاپر قوم فروش نہیں بن سکتا۔(۱۲(

پریم چند کے افسانوں میں خود کلامی کی جتنی بھی صورتیں ملتی ہیں وہ اگرچہ مکمل اور باقاعدہ نہیں ہیں تاہم یہ اردو افسانے کا ابتدائی خاکہ ہونے کی وجہ سے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہی۔خودکلامی کے یہ تکنیکی تجربات اگر ایک طرف پریم چند کے پختہ تخلیقی ذہن کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو دوسری طرف ان تجربات سے اس عہد کے کرداروں کے ذہنی و نفسیاتی ارتقا کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو افسانے کے ابتدائی دور میں خودکلامی کا اظہار درحقیقت انسانی فطرت کے لاشعوری محرکات کا نتیجہ ہے جو پوشیدہ اور ظاہری دونوں صورتوں میں انسان کی تخلیقی کاوشوں کا لازمہ رہے ہیں ۔

حوالہ جات:

)۱(پریم چند ،سوزِ وطن ، لاہور:گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو،س۔ن ص ۴۱۔۳۹

)۲(ایضاً ، ص ۵۹

)۳(پریم چند،کلیات پریم چند،مرتبہ:شیما مجید، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۰۹ء،ص۱۳۶

)۴(آصف نواز(مرتب)، پریم چند کے سو افسانے از پریم چند، لاہور: چودھری اکیڈمی، س ن، ص ۲۷۰

)۵(ایضاً ، ص ۲۷۰
)۶(ممتاز شیریں ، معیار، لاہور: نیا ادارہ، ۱۹۶۳ء،ص ۱۶-۱۷
)۷(پریم چند ،واردات، دہلی: مکتبہ جامعہ،۱۹۳۷ء،ص ۱۷-۱۸
)۸(ایضاً ، ص ۲۹-۳۰
)۹(آصف نواز(مرتب)، پریم چند کے سو افسانے از پریم چند، لاہور: چودھری اکیڈمی، س ن،ص ۶۸۹
)۱۰(پریم چند، واردات، ،دہلی: مکتبہ جامعہ۱۹۳۷ء،ص ۷۷
)۱۱(ایضاً ، ص ۷۷
)۱۲(آصف نواز(مرتب) ، پریم چند کے سو افسانے از پریم چند، لاہور: چودھری اکیڈمی، س ن ،ص ۲۷۰

/...../